ہمچو ادھم بحرِ حق بایک پیالہ جستہ اَم　　مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ باباعبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۳

ناگپُور

اسے والدہ صاحبہ کی جانب سے روحانی تربیت کا اثر کہہ لیں یاوالد صاحب سے حاصل کردہ اخلاقی دینی تعلیم اور بزرگوں کی داستانوں میں خصوصی دلچسپی، کہ روح کی ازلی تڑپ نے ناگپور بابا تاج الدینؒ کے حضور، حاضری دینے کی جانب رجوع کیا۔ کس کیفیت، کس حال میں کسی بزرگ تک پہنچتے ہیں یہ قسمتوں کی بات یوں ہے کہ کسی بزرگ تک رسائی بغیر اس کی اپنی مرضی کے ناممکن ہے۔ مثلاً شیانِ حق کو حق کی اتنی تلاش کہاں جو خود حق کو ان کے لئے ہوتی ہے اور بات کچھ یوں بھی ہے کہ ایک بڑے مقناطیسی دائرہ اثر میں ایک چھوٹی مقناطیس کا رخ مرکزِ اثر کی جانب ہو جانا، لازمی سا بھی ہوتا ہے۔ شعوری یالاشعوری طور سے یہ کشش اپنا اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ کمسن جوانی کے الہڑپن کا زمانہ بھی اپنی ایک حسین معصومیت لئے ہوتا ہے۔ علم و دانش کی بندشوں، عقائد کی ناپ تول، عارضی نفع نقصان کی طلب سے یوں بھی انسان اس زمانہ میں آزاد ہوتا ہے۔ اپنی باطنی صلاحیتیں ایک ہیجانی، جذباتی انداز میں اس وجود سے پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ قدم قدم پر دل کی دھڑکنیں، ایک والہانہ نامعلوم سا شوق، خاکی جسم کے خول کو پھاڑ کر باہر نکل آنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ اب کہیں انسان فطرت کے ظاہری باطنی توازن کی میزان ایک مدہوشی کے سے عالم میں قدم رکھ چکا ہوتا ہے ایک پل صراط، بال سے باریک راستے پر زندگی کا سفر ہوتا ہے۔ وجود کی نفسانی خواہشات نے اگر اس فطری بیتابی پر قابو پالیا تو عقل و جسم کی سطح پر تسکین پاکر گہرائیوں کے غار میں جا گرتا ہے اور اگر روح کی فطری بے تابیوں کو عروج کی راہ ملی تو جسم کی خواہشات فنا ہو کر اس الطف حالت میں یہ پُل صراط بھی پار ہو جاتی ہے۔ وجود کی بندشوں اور خواہشات کے بوجھ سے، جس ذرہ کو اپنے جذبات کی مدہوشی میں نجات ملی وہ کھنچ کر مقناطیس سے جاملتا ہے۔

ناگپوریوں تو بتہ سے پہنچے اور اس گنج العلوم سے بے فیض بھی کوئی نہیں گیا اس باطنی ماحول کی جلالی شان کی داستانیں تو ہزاروں ہیں۔ سمجھ اپنی اپنی، ہوش اپنا اپنا، دل اپنا اپنا، ایمان اپنا اپنا۔ مگر کچھ ایسے بھی تو ہوں گے جو ایک ناگ کاٹے کا سانشہ لے کر پہنچے۔ یہ کیفیت اسی سے پوچھو جسے عشق کے ناگ نے کاٹ لیا ہو۔ ایک میٹھا میٹھا نشہ مدہوشی در مدہوشی کا عالم۔ زیست اور موت کی برزخ۔ جو اس لذت سے ناآشنا ہو وہ کیا جانے کہ ناگپور کے ناگ کا روپ کیا تھا۔ اور کس طرح یہ امت کے درد کا زہر اپنے وجود میں جذب کر کے تریاق بنا دیا جاتا ہے جہاں فرد کی چلہ کشی کے لئے چالیس دن سے چالیس سال تک کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا وہاں امت کی ارتقائی منازل کیلئے ہزار سال بھی تھوڑے ہوتے ہیں۔ اسی لئے انقلابی طریقہ سے بھی قوم کی حیاتِ نو کے لئے کم از کم اس کا ہزارواں حصہ تو ضرور درکار ہے۔ اس لئے جلد ہی زمانہ دیکھ لے گا کہ اس دنیاوی مارگزید وامت کو یہ باطنی تریاق، کن کن وسیلوں سے پہنچا دینے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔

اس امت کی شفایابی کے لئے انقلابی طریقہ کی بھی ضرورت ہے اور ارتقائی کی بھی۔ انقلابی طریقہ سے عقل و ہوش کی روکاوٹوں اور توہمات کو دور کیا جاتا ہے تو ارتقاء کی دھیمی چال سے باطنی اصلاح کی جاتی ہے۔ اس طرح شجر مبارک کی آبیادی دونوں پہلوئوں سے کرنا فقراء کا کام رہا ہے۔ قومی انحطاط اور بے بسی کے زمانے میں، انقلاب کے بغیر کام نہیں بنتا۔ جب ایک روحانی آتش فشاں ظہور میں آتا ہے تو مردہ مٹی کے ڈھیر کے اندر کے جذبات بھی پھٹ پڑتے ہیں جو سب غیر اللہ کو بھسم کر ڈالتے ہیں۔ اب یہی زمین روئی کی کاشت کے لئے زرخیز ہو جاتی ہے۔ روئی سے حسد، غصہ، لالچ،

خواہش نفسانی کے چار بنولے نکال کر جب اپنے وجود کو روئی کی طرح دھنکا جاتا ہے تو تُو ہی تُو، اللہ ہُو کی ضرب سے ساری گتھیاں عقل و دانش کی سُلجھ جاتی ہیں۔ اب یہ دُھنکی ہوئی روئی کہیں جمیعت کے انداز میں دھاگہ بٹنے کے کام آتی ہے۔ پھر ایک ایک ڈورا اپنی انفرادیت کا ایک ہی حبل اللہ میں ضم کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ مجذوبین، باطنی نظام کے موکل بن کر وہ کام کرتے ہیں کہ عقل و دانش خیرہ ہو جاتے ہیں۔ یہ جذب اپنے اندر غرق ہونا ہے۔ غرق ہونا آسان نہیں۔ لاکھوں میں ایک، وہ بھی صرف اللہ کے فضل سے۔ یہ انفاس کا راستہ ہے۔ من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ۔ اسی لئے مجذوب کی صحبت میں برابر اللہ کا خیال رہتا ہے۔ مجذوب سب سے کٹ کر اللہ کی ذات کو اپنائے ہوتا ہے۔ خود اسم اللہ جسم فقیر کا مصداق ہوتا ہے کیونکہ العشق جذبۃٌ من جذبات الحق (عشق ایک جذبہ ہے اللہ کے جذبوں سے) جب کسی کو نگاہِ بصیرت مل جاتی ہے تب ہی اس کی نظر ظاہری پردوں کو چاک کر کے کسی ہستی میں حُسنِ مجرد کی جھلکیاں دیکھ سکتی ہے۔ بابا تاج الدینؒ کا ظاہری روپ وہ پیشانی کی چمک نورٌ علیٰ نور وہ نشستِ جسم قدوسی، سراپا وصل و قرآن۔ وہ جسم پر برص کے نشان امت کے جذام کی نشانی یہ ہے وحدت الوجود کی تصویر بالشہود۔ جانِ من جانِ عالم کا سراپا وہ جلال کو جمال میں جذب کر کے جمال میں ڈھالنا قدوسیتِ لازوال کی نشانی بنا کر جب بابا صاحب کی آنکھوں میں سمٹ آئی تو جدھر نظر ڈالی اندھیرے اجالے ہو گئے۔ خلقت کے کام صرف ایک نظر کے ذریعہ ہونے لگے۔ وہ نظر کیا تھی، اک ننگی تلوار۔ اک برق رعداں۔ پھر یہ ظاہر بیں نگاہوں سے پردہ کس لئے۔ وجہ یہ ہے کہ حق پردے میں ہے اور ہمیں آشکار کیا۔ بدلہ یہ ہے کہ ہم پردہ میں رہ کر اسے آشکار کر دیں۔ حق ہمارے وجود سے خود بخود نشتر ہو رہا ہو اور متلاشیانِ حق خود بخود اس جانب رجوع ہوں اور مٹی کے جسمانی بت سے ماوراء، حق کی کار فرمائی ہی کی تجلی دیکھیں۔ یہ راہ دشوار بھی ہے مگر عشق کی فطری صداقت میں آسان بھی ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو باعث تخلیق کائنات ہوا اور کائنات فطرت میں اس عشق کی تجلی کے ذریعہ ہی حق تک رسائی کی راہ کُھلی، عقل کو رہیں تو مٹی کے جسم سے آگے کیا دیکھ سکتی ہے اور فطرت کی توحیدی یکتائی میں بھی اپنی "میں" شامل کر کے شرک کی خود مرتکب ہوتی ہے اور مشرک یا مرتد دوسروں کو گردانتی ہے جو حسن مجرد کو مٹی کے جسم سے پرے حق کی تجریدی تجلی میں دیکھتے ہیں ان ہی کی نگاہ پاکباز بھی ہوتی ہے اور موحد بھی اور وہ مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ برعکس رخسار میں انہیں نورِ ازلی کی جھلک ہی ملتی ہے۔

اب اسے کششِ ازلی ہی کہہ لیں کہ قبلہ درانی صاحب چودہ سال کی عمر میں جب پہلی بار ناگپور پہنچے تو شام کا وقت تھا۔ اپنی یہ حالت تھی کہ عرصہ سے زہر عشق کی مدہوشی سی طاری رہتی نہ دنیا کی طلب۔ نہ مقاماتِ فقر کی منازل طے کرنے کا شوق۔ بس ایک شدتِ عشق۔ ایک والہانہ پن۔ بے سبب۔ بے آرزو۔ بے تمنا۔ باہر خسرو کی سی شوخی تھی تو اندر خسرو جیسا شمع کا سوز۔

زندگی کی سب دلچسپیاں اس موت و زیست کی برزخ میں یوں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ جسم ایک سوکھا ہوا ڈھانچہ۔ کیسی تمنا۔ کیسی طلب۔ کیسا حرفِ سوال جس کا وجود خود حرفِ سوال بن گیا ہو وہ کیا سوال کرے۔ جس کے تن بدن میں عشق کا زہر پھیل چکا ہو اس کو کیا دنیا کے ڈھول نقارے ہوش میں لائیں۔ مگر یہ عشق ایک بھڑکتی ہوئی آگ بھی تو ہوتا ہے۔ العشق نارٌ محرقٌ اب اس آگ کو جو ایک آئینہ ملا تو اندھیرے، اجالے ہو گئے۔ آنکھیں چکا چوند گئیں۔ بابا صاحب اس وقت گھوڑے پر سوار تھے اور معمول کے مطابق سیر کو نکلے تھے ارد گرد خلقت کا ہجوم تھا۔ قبلہ کی جو ادھر نظر پڑی تو بابا صاحب کی جگہ اس کا سراپا دیکھا جس کی تصویر دل میں بسی تھی۔ اس تجلی سے کچھ ایسی آنکھیں خیرہ ہوئیں کہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وجود میں تلووں سے لے کر سر تک آگ سی لگ گئی۔ لڑکھڑا سے گئے۔ بابا صاحب کی نظروں نے سنبھالا دیا۔ اب جو چہرہ سے ہاتھ ہٹائے تو بابا

صاحب ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ اب کہیں قبلہ پر یہ بات روشن ہوئی کہ آئینہ ذات میں اپنی باطنی کیفیت کا ہی مشاہدہ ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حُسنِ ذات ایک ہی ہے۔ خواہ کسی روپ میں ہو۔ حُسنِ لیلیٰ عکس رخسارِ من است والی بات کو ان مٹی کی آنکھوں سے بھی دیکھا اور تیسری آنکھ سے بھی جو حقیقی آنکھ ہے۔

شام گزری رات آئی۔ بھوک لگی۔ ایک آنہ کا دودھ لیا۔ تاج باباؒ نے اپنے ہاتھوں سے مسل کر دودھ میں پیڑا ڈالا۔ قبلہ کو اس وقت نہ گھِن آئی نہ نفرت۔ اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔ ایک مستی طاری تھی۔ دیدار کی مستی۔ یا ایک نشہ تھا، ناگ کاٹے کا نشہ، ہوش اور مدہوشی کی برزخ۔ اس دودھ کی لذت آج تک یاد ہے۔ دودھ پینا تھا کہ سَن سے بدن میں، پیٹ میں، قلب میں ایک ارتعاش سا آگیا۔ اسمِ ذات روئیں روئیں، عضو عضو سے جاری ہو گیا۔ یہ تھا بابا صاحب کا فیضان جس نے ہر لا الہٰ کی لا کر کے الا اللہ کا رنگ جما دیا کیسی ریاضت۔ کیسی منجھائی۔ کیسا اوراد کا سبق۔ اپنا وجود اور پتہ پتہ اس ذکر کی تائید کرا اٹھا اور یہ ذکر ایسا قیام کر گیا کہ ہر حال، ہر کیفیت میں اس نے بعد کے زمانے میں ساتھ دیا یہاں تک کہ برسوں بعد جب بابا قادر اولیاءؒ کے یہاں شرفِ باریابی ملا تو ان کے کرم و احسان سے اس ذکر کے جلال کو ایک جمالی شان نصیب ہوئی۔ تاج الدین جو روئیں روئیں میں بس گیا تھا اس کے جلال کو جب بابا قادر اولیاء نے رگ رگ سے باہر کھینچا تو وہ موت کی سی اذیت قبلہ کو اب بھی یاد ہے مگر ساتھ ہی بابا قادر اولیاء کے احسان سے جو نئی حیاتِ روح ملی اور ارتقائے باطن کی راہ کھلی وہ بھی تو اسی چشمۂ فیضان کی دوسری شیرینی تھی۔ جس کا منبع بابا تاج الدینؒ کی ذات تھی۔

ذات کے دونوں پہلو جلال، جمال ہی ذات کی اکملیت ہوتے ہیں۔ جب تک جلال کو بھٹی سے کندن ہو کر نہ نکلے، جمال کی جلا نہیں چڑھائی جا سکتی۔ اس لئے جس کام کی تکمیل بابا تاج الدینؒ نے اپنی وجودی زندگی میں نہ کرائی تھی۔ وہ اپنے ہی نورِ عشق، بابا قادر اولیاء کے ذریعہ کرا دی۔ زمانہ شاہد ہے کہ قبلہ درانی صاحب میں بابا تاج الدینؒ کا جلال، بابا قادر کا جمال دونوں ہی ایک توازن میں ہو کر کمال کا روپ لئے ہیں۔ اور ایسے پردہ در پردہ اور حجابات در حجابات میں کہ اس حُسن ولایت کی جھلک بھی ان مٹی کی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتی۔

بابا تاج الدینؒ فنافی الشیخ تھے، فنافی اللہ۔ یعنی فنافی الذات کی جلالی شان۔ بابا قادر اولیاءؒ فنافی الرسولؐ تھے۔ جمالی شان کے پیکر۔ گویا لا الہٰ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ۔ اس طرح پورے کلمہ کی تفسیر، جیسے دو مل کر ایک جسم۔ پھر کوئی تیسرا پیکر ایسا بھی درکار تھا جو پہلے کی تصویری پیکر اور پھر دوسرے کی تصویری کاپی اپنے باطن میں مکمل کر لے اور اس طرح پورے کلمہ کی تکمیل اپنے باطن وجود میں ہو جائے۔ ان باتوں کی فہم، عقل و ادراک سے پرے، نورِ باطن کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس زمیں نہ کسی کی ذاتی کوششوں کو دخل ہے نہ اس کی ظاہری ریاضتوں یا مجاہدوں کو۔ یہ تو کچھ جیسے قدرت کے منشاء کے تحت، زمانہ کے اعتبار سے کسی وجود کو پہلے سے چُن لیا جاتا ہے اور اُسے امت کا بارِ امانت سونپ دیا جاتا ہے اس فقیر کی اپنی ذات کے لئے یہ نہ نام و نمود والی بات ہوتی ہے نہ وہ کسی طور پر بھی اس راز کو افشاء کر سکتا ہے۔ بابا تاجؒ کا جب بارِ امانت کسی دوسرے کو سونپ کر رخصت ہونے کا زمانہ آیا تھا تو فرمایا تھا "بلی رام" ہاتھی پر سوار ہو کر آئے گا۔ راز کی بات راز میں ہی کہہ دی۔ "بلی رام" "اللہ ولی" "قادر ولی" اور ہاتھی اس کی روح کی سواری۔ جیسے حضرت آدم کا بیل۔ حضرت عیسیٰ کا گدھا۔ حضرت علی کا شیر۔ پیرانِ پیر کا گھوڑا۔ نبی کریم ﷺ کا اونٹ اور معراج پر براق۔ بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ روح کی بصیرت کس کس کے نصیب میں۔ اور ابھی تو قبلہ کے لئے فقر کے میدان میں قدم رکھنے کی پہلی ہی منزل تھی۔ ایک ناسمجھی کا سازمانہ۔ وگرنہ جس کی نظروں میں اس راہ کی دشواریاں پہلے سے کھول دی جائیں وہ اُلٹے پائوں ہی واپس جائے مگر مشیتِ ایزدی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ کاروبارِ جہانِ عالم کو چلانے کے لئے، بہت کچھ پہلے سے عالم مثال میں کر دیا جاتا ہے اور ان ہی نقشوں کے تحت عدم سے وجود میں لایا جاتا

ہے۔ قبلہ کا ناگپور پہنچنا بھی کچھ ایسے ہی مقتضائے الٰہی کے تحت ہوا۔ ابھی ناگپور آئے دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن بابا کی سواری کے پیچھے جہاں خلقت بھاگتی تھی یہ بھی تانگہ کا کنارہ پکڑ کر بھاگنے لگے۔ بابا نے دو تین دھپ کمر پر لگائے جن کی یاد جب بھی کرتے ہیں وہی کیفیت، وہی آواز وہی دھپ آج تک کمر پر محسوس ہوتی ہے یہ دھپ کیا لگنا تھی کہ آہستہ آہستہ کیفیت بدلنی شروع ہوئی۔ خاموشی، تنہائی، گم سم سی حالت ہوتے ہوتے جذب طاری ہو گیا ایک نئی پُر کیف دنیا میں آ گئے۔ نہ کپڑوں کا ہوش رہا، نہ کھانے پینے کا۔ ایک مستی سی، ایک لذتِ حُسن سی، ایک عشق کی تڑپ سی، ایک اپنی ذات کی مستی۔ اجبت عن اُعرف کی کیفیت۔ ہر چیز حسین۔ دھوپ کی شدت حسین، موسم کی سختی، جسم کی تکالیف، بھوک، پیاس سب کچھ حسین۔ بابا کی نگاہ کیا پڑی کہ قلب کی دنیا ہی بدل گئی۔ کپڑے تک اتار پھینکے۔ یوں بھی جب دوئی کا پردہ اٹھ جائے، کوئی غیریت نہ رہے تو ان عارضی پردوں، لباسوں کی ضرورت بھی کیا ہوتی ہے۔

کمر پر دھپ لگاتے وقت بابا تاجؒ نے فرمایا۔ ابے مرغے، گویا قبلہ کے باطن کے روپ کا اظہار کر دیا۔ بابا تاج کا طریقہ کار انقلابی تھا۔ دھپ لگنا تھا اور ذکر جاری۔ قبلہ کی ہمیشرہ نے اسی زمانہ میں بشارت میں دیکھا کہ ایک کلغی والا مرغ کلیلی کو کھا رہا ہے۔ یہ کلیلی وہ ٹی۔ بی تھی جو اس زمانہ میں قبلہ کو تھی۔ اس طرح اپنے باطن نے اپنی ٹی۔ بی کو کھایا۔ وِدَر۔ ای سادھو کی انگریزی کتاب میں بھی مرغ کا ذکر ہے۔ مُرغ بغل میں ہے۔ اس کو حلال کرتے ہیں تو خون کی ندی کے پار ایک بکری کھڑی ہے۔ ارتقائے باطن کی یہ کڑیاں درکڑیاں بابا قادر اولیاء کے دربار میں طے کرائی گئیں۔ بابا قادر اولیاء کا انداز صرف محبت تھا اور نگاہِ طریق کار یہ ارتقائی راستہ تھا۔ قادر نگر کے قیام میں بشارتوں میں یا جذب کی حالت میں قبلہ نے اپنے اندر باطنی ارتقاء کی منزلیں خود دیکھیں۔ باطن جاگنے کے بعد اپنے اعمال کا تعلق جبلتوں سے ہوتا ہے جیسے اعمال خود بخود ہو رہے ہوں۔ یوں عقل و ہوش کے سہارے عمل پیرا ہونا علیحدہ بات ہے اور جبلتوں اور باطن کے زیر اثر عمل پیرائی علیحدہ بات ہے۔ یہی حقیقت ہے جس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ اپنے اندر جو ہے اسی کی عمل پیرائی ظاہر میں ہے۔ کوئی دوئی نہیں۔ اپنی توحید میں عمل پیرائی ہے۔ اس باطن کے جاگنے کی ابتداء ناگپور سے ہوئی اور یہی بابا تاجؒ کا احسان تھا کہ صدیوں کی گم گشتہ روح کی یوں انقلابی طریقہ سے بیدار کر دیا۔

قبلہ کا فرمانا ہے کہ یہ دور بھی عجب دور تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ذکر کرتا ہوا محسوس ہوتا ایک ہی یکتائیت توحید میں ایک ہی وحدت وجود میں۔ تاج الدین، تاج الدین رگ و پے میں سما گیا تھا۔ دو سال یہ کیفیت رہی۔ علی گڑھ کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ عزیز و اقرباء سمجھ بیٹھے کہ دماغ کی خرابی ہے۔ کون اندر جھانک کر دیکھتا کہ وہاں کیا گزر رہی ہے۔

قبلہ کے والد صاحب حقیقت شناس ہستیوں میں سے تھے۔ بابا تاج الدینؒ کے مقام سے بھی آشنا تھے۔ اس لئے اپنے بیٹے کی اس حالت جذب کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے اس وقت کو گزرنے دیا پھر دو سال بعد بابا تاج الدینؒ کے پاس لے گئے اور عرض کی کہ آپ نے میرے بچہ کو کیا کر دیا ہے۔ بابا صاحب مسکرائے اور فرمایا اچھا کمبل اوڑھائے دیتے ہیں۔ ان کا یہ فرمانا تھا اور ادھر قبلہ درانی صاحب کا یہ حال ہوا کہ جیسے آنِ واحد میں اس کیفیت و انبساط و سرور کی دنیا سے ادھر عالمِ رنگ و بُو کے حبس میں پھر سے آ گئے جس نے آزادی دیکھی ہو۔ روح کی کیفیات و لذات سے آشنا ہو چکا ہو اسے پھر سے اس جسم کے پنجرے میں قید کر دیا جائے تو کیونکر نہ چلائے، فریاد کرے۔ مگر یہ دنیا، اس کی پابندیاں، اس کا اپنا اصولِ حیات۔ اب کہیں ہوش میں واپس آ کر قبلہ درانی صاحب کو اپنی گزشتہ حالت کا احساس ہوا۔ مٹی کی آنکھیں اب اپنے وجود اور ارد گرد کے وجود پر پڑیں

تو گزشتہ زندگی یاد آئی مگر ساتھ ہی سخت صدمہ بھی ہوا کہ کن لذتوں کی زندگی اور سرور کی کیفیات سے، کس آتش زار میں، پھر سے یہ ہوش کی دنیا لے آئی۔

اس کے بعد پھر سے علی گڑھ میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ گھر سے علی گڑھ آتے جاتے راستہ میں ناگپور ضرور اترتے اور بابا صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے۔ یہ سلسلہ بابا صاحب کے وصال کے بعد بھی، یعنی ۲۶ء کے بعد بھی جاری رہا۔ ناگپور کے مختلف قیاموں کے دوران کے چند واقعات ہی اس جگہ بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ بابا تاج الدینؒ کی کرامتوں کے احوال یوں تو عام لوگوں کی زبانوں پر آج تک ہیں۔ اب بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے خود آنکھوں سے دیکھا کہ بابا صاحب ایک وقت میں یہاں بھی ہیں وہاں بھی۔ قبلہ کے عزیزوں میں جو ناگپور سے پانچ سو میل کے فاصلہ پر رہتے تھے بابا صاحب پہنچے تھے۔ چائے پی تھی اور تسلی تشفی دی تھی اور اِدھر ناگپور سے بابا صاحب بالکل باہر نہیں گئے تھے۔ خود قبلہ نے بابا صاحب کا ہاتھ اپنے کاندھے پر دیکھا تھا۔ جب وہ ولایت میں ایک وقت یہ بھول چکے تھے کہ بابا ساتھ ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی آنکھوں اور عقل کو خیرہ کر دینے والی باتیں اس دربار میں دیکھی تھیں۔ قبلہ نے بھی اُس پیدائشی اندھے کو دیکھا تھا جو اکثر بابا آنکھیں دے۔ بابا آنکھیں دے پکارا کرتا تھا۔ پھر وہ بھی دن آیا جب بابا نے ایک دن اِدھر سے گزرتے ہوئے ایک لات ماری اور کہا "ابے تو سب ہی دیکھ لے گا" اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ اس شخص کی آنکھیں پک آئیں اور آنکھوں سے پٹی بندھی رہنے لگی۔ اور ایک دن جب بابا صاحب کے اشارہ پر پٹی کھولی گئی تو اس کی بینائی آچکی تھی اور ساتھ ہی تیسری آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ قبلہ کے علم میں وہ واقعات بھی تھے جب ایک گانے والی جو اکثر "تاج الدین، نور مبین، عظمت والے بابا" گایا کرتی تھی کنویں میں گر کر مر چکی تھی۔ اس کی لاش پر بابا کا جُبہ ڈالا گیا تو وہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھی تھی اور وہ واقعہ بھی جب ایک پارسی لڑکی جس کے ذمہ بابا صاحب کو چائے پلانا ہوا کرتا تھا، مر گئی اور والدین بابا صاحب کے پاس خاموش جا کر بیٹھ گئے تو بابا صاحب کے دریافت حال پر انہوں نے کہا تھا کہ لڑکی مری پڑی ہے اس پر بابا صاحب نے فرمایا تھا مری نہیں ہے، سو رہی ہے اور باپ کو کہا جا لڑکی سے کہہ کہ بابا کو چائے دے۔ باپ نے لاش کو یہی الفاظ کہے اور لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قبلہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ایک نوجوان جس کے دونوں بازو ریل کے ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو چکے تھے یہی رٹ لگائے رکھتا تھا کہ بابا ہاتھ دے۔ لوگوں کے سمجھانے پر بھی وہ اپنی ضد سے نہ ہٹا اور عرصہ تک یہی مانگتا رہا۔ بالآخر بابا نے ایک دن اس سے کہا کہ جا، کام کر۔ عرصہ کے انتظار کے بعد جو اُس خوش نصیب کو یہ الفاظ براہ راست بابا صاحب نے کہے تو اس نے انہیں اس انداز میں لیا کہ قسمت کھل گئی۔ اب اس نے پہلے پہلے سائیکل مرمت کی دوکان کر لی۔ اپنی نگرانی میں مستریوں سے کام کراتا رہا۔ بڑھتے بڑھتے اس نے موٹر مرمت کی دوکان کی۔ پھر ایک کارخانہ کھول لیا۔ اس کی آمدنی سے نہ صرف اس کے والدین کے بلکہ تمام لواحقین اور مزدوروں، ملازموں کے خاندانوں کے اخراجات کھانا پینا کپڑا رہائش، شادی بیاہ سب ہی ہوا کرتا۔ اس طرح اس لڑکے کو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں کی جگہ یہ درپردہ بہت سے ہاتھ مل گئے اور اسے اس پر ایمان بھی تھا کہ صرف اپنے ہاتھ مل بھی جاتے تو بھی کیا کرتا اب تو بابا کے کرم سے یہ چاروں طرف کام کرنے والے سارے ہاتھ اس کے ہاتھ تھے۔

مگر یہ ظاہر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے قبلہ کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ دیکھا بھی تو کیا کیا۔ جاننا تو ہو جانا ہے جب ظاہری علم تک کو عملی صورت میں بروئے کار لانے کے بغیر کام نہیں بنتا تو باطنی علم کو بس حیران نگاہوں سے دیکھ کر حیران رہ جانے سے کیا بنتا ہے یہ جو سچائی، یہ جو اعجازات، خلقت کے آگے بابا تاجؒ پیش کر رہے تھے آخر ان کے پیچھے کیا حق کی رضا تھی، قبلہ نے اُس زمانے میں بھی اور بعد کے زمانے میں بھی جب بابا تاجؒ کے وصال کے بعد برسوں، تنہائیاں در تنہائیاں اس روحانی سفر میں رہیں، ان حقیقتوں کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کی۔ اکثر اس عقدہ کا حل تلاش کرنا چاہا کہ

فقر کے اس روپ میں کیا مقصد فطرت پوشیدہ تھا۔ ان ظاہری کرامات کے پردوں میں چھپ کر۔ اس ظاہری مجذوبانہ زندگی کے احوال میں حجاب لے کر آخر بابا تاجؒ کونسی ولایتوں کی حفاظت کر رہے تھے، جس کی عصمت آمرین حق کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھنی تھی۔ اب نظر آتا ہے کہ ان باتوں کو جاننے کے لئے اسی مشیت ایزدی کی طرف نگاہِ بصیرت کرنی ہوتی ہے جس کے تحت کسی فقیر کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خلقت کو حق کی جانب رجوع کرے۔ اس کے لئے پہلے اپنی ذات سے لگاؤ اور لگن کے جذبہ کو وہ شدت دے کہ اپنی قید سے انسان کو نجات ملے۔ تُو ہی تُو اس کے روئیں میں بس جائے یہاں تک کہ تُو ہی تُو، اللہ ہُو کی راہ اس کے لئے کھل جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بے سہارا، بے آسرا مسکینوں کو اس دنیاوی زندگی میں بھی فیض پہنچتا رہے کہ ربوبیت حق کا یہی تقاضہ ہے یوں بھی الخلق عیال اللہ کے تحت خلقت کی دیکھ بھال ہر صاحب اقتدار کے لئے فرض ہے۔ روپیہ پیسہ والوں کے لئے روپیہ پیسہ کی حد تک۔ علم والوں کے لئے علم کی روشنی پہنچانے تک اور علیٰ ہذا القیاس آمرین حق کے لئے امر کی سطح پر۔ مگر یہ تو رہی فرد کی حد تک بات۔ جمیع خلائق کے لئے، امت کے لئے جس سطح پر کام کرنا ہوتا ہے وہ تو عالم مثال کی بات ہے۔ فقر کی باطنی سطح کی بات ہے کہ باطن انسانیت جو صدیوں کی زنگ آلودگی سے خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ اسے برقِ تجلی کی حرارت سے ہی پھونک کر کندن بنایا جاسکتا ہے۔ یہ محویت در محویت کے عالم میں شدتِ ذکر کی لطافت میں ہی ممکن ہے کہ اس حالتِ یکتائی میں، خود مرکز کائنات ہو کر، وجودی زندگی کو بھی حیات بخشنے کا ذریعہ عطا ہو۔ باطن کی یہ راہ اس برصغیر میں بابا فریدؒ کے احسان سے کھلی اور اس چودھویں صدی میں آمران حق کا یہی اولین فریض رہا کہ باطن عالم انسانی کو باطن کی راہ سے وہ تربیت دے دی جائے جو آگے چل کر باطن جمیعت کے حسن کی جلوہ افشانی، ظاہری زندگیوں میں بھی کرا دے۔ باطنی راستہ ارتقاء کا ہے ارتقائے باطن کی دھیمی چال۔ اس کا تعلق ظاہر کی دنیا سے اس طرح وابستہ ہے کہ باطن کی اصلاح ہوئی۔ باطن جاگا تو ظاہر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ طریقہ سالک کا ہے اور مجذوب کا طریقہ، انقلابی ہے۔ عقل وہوش کی دنیا میں انقلاب، عقل کو خیرہ کر دینے والی حرکات وسکنات۔

اُن فقرائے باطن کا باطن تو نرالا ہوتا ہے ہی، ان کا ظاہر بھی نرالا۔ ان کی باتیں بھی نرالی۔ ان کا گفت ایک آیت ایک نشانی۔ پھر اس عقل کی فریب خوردہ انسانیت میں بیٹھ کر فقیر انا امتی کو بھی تو جنونِ عقل کا بہروپ لینا تھا، جو اس عقل ظاہر بیں کو حیران کر دے یہ گویا انقلابی طریقہ ہے، ظاہر میں، عقل میں، ایک انقلاب بپا کر دینا۔ اور پردہ یوں کہ انسانی ذہانت اور دماغ کی کرشمہ سازیاں اس مجذوبیت کے پردہ کو عبور نہ کر سکیں اور معلم الملکوت کے چیلے دُور ہی رہیں۔ مگر اس جذب و جنوں کے پیچھے پردہ کر لینے کے باوجود خلقت برابر باباصاحبؒ کو گھیرے رکھتی۔ سواری باہر نکلتی تو خلقت ساتھ لگ جاتی۔ ایک دن باباصاحب کی سواری جاتی تھی۔ خلقت پیچھے بھاگ رہی تھی۔ قبلہ درانی صاحب بھی ساتھ ہی لگے تھے۔ دربار کے ملنگ، ٹائیگر مستان بھی برسوں سے دربار میں تھے۔ آج ان پر بھی ملنگی چڑھ گئی۔ مستان ٹانگے کے آگے کچھ فاصلے پر بیچ سڑک میں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے کہ ٹانگہ روکا جائے۔ زوردار آواز میں ٹائیگر مستان نے باباصاحب سے کہا۔ یہ خلقت تیرے پیچھے بھاگ رہی ہے اور تو انہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہے۔ باباصاحب کا بھی آخری زمانہ تھا۔ سخاوت کے دریوں بھی کھلے تھے۔ مستان کا یہ کہنا تھا اور باباصاحب نے وہ تمام ہار جو اپنے اوپر اور تانگہ کے ارد گرد تھے اٹھا کر پھینکنے شروع کیا۔ فقیری یوں سربازار لٹا کر چل دینے والے کم ہی آئے ہوں گے۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ یہ بھی نقشہ تھا عجب۔ صدیوں کی میراث یوں سربازار لٹائی جارہی تھی۔ جسے بھی اُن ہاروں میں کی ایک بھی پتی ملی یا اُس تک کسی طرح پہنچی وہ بے ریاضت کے بہت کچھ لے گیا۔ خود قبلہ کی گردن میں ان ہاروں میں سے ایک ہار بے طلب بے تمنا کے ایسا آن گرا جیسا کہ یہ مقرر تھا۔ رحمت کی ہوائوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب چلتی ہے تو اچھے برے سب ہی اس رحمت کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ اس عالم میں رحمتوں کی فراوانی کچھ اسی انداز میں ہے۔ بس نگاہ اور دل رجوع ہونے کی بات

ہے۔ شمسی حقیقت کی تجلی بلا خصوصیت سب کے لئے ہے۔ کوئی آنکھیں بند کرلے یا تاریکیوں میں چھپ جائے یہ اس کی اپنی خود ساختہ بد قسمتی ہے۔ ناگپور میں بابا تاجؒ کے دربار میں پڑھے لگے لوگ جبل پور والے بابا نیل کنٹھ رائے کے پاس بھیجے جاتے جو شکر دھرا سے قریب ہی بابا تاجؒ کی حضوری میں برسوں سے پڑے ہوئے تھے نیل کنٹھ رائو ایم۔ اے فلاسفی تھے۔ اور تعلیم سے کافی شغف رکھتے تھے۔ اپنے فطری تجسس حق کی تڑپ میں کتابوں کو ہی اپنی مشعل راہ بنایا تھا اور اپنے علم کی روشنی سے ہی راہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنی منزل، ناگپور پہنچے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بابا تاجؒ کے دربار میں پہنچ کر ان پر بھی جذب کا وہ رنگ چڑھا کہ ذات پات سب بھول کر عشقِ مسکین کی تصویر بن گئے تھے۔ اکثر جذب کی حالت میں ہی رہتے۔ مگر ہوش کے عالم میں جب کچھ پڑھے لکھے خوش نصیبوں کو ان کے پاس بھیجا جاتا تو تصوف اور عرفان کے وہ رمز کھولتے جن کی، ان متلاشیانِ حق کو تلاش ہوتی تھی۔ یہی جبل پور والے بابا تھے جو بابا قادر اولیاء کو ان کی ناگپور پہلی حاضری کے موقع پر دیکھ کر ایک بار، کبوتر کی طرح زمین پر لوٹے تھے کہ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ تمہارے میں کیا کمال ہے یعنی ہم برسوں سے آگ میں جل رہے ہیں اور تم پر بابا تاجؒ کی نظر التفات آخر اتنی کیوں ہے اس پر بابا تاجؒ نے جبل پور والے بابا کو ایک موقع پر یہ کہہ کر کہ ارے تو ہمارے میں کیا کمال دیکھنا چاہتا ہے۔ حیرت میں ڈال دیا کہ بابا صاحب نہ صرف ہر بات سے واقف ہیں بلکہ بابا قادر اولیاء کو وہ قُرب عطا کر چکے ہیں کہ "تو من شدی من تُو شدی۔" قبلہ دُرانی صاحب اکثر گھنٹوں، جبل پور والے بابا کی صحبت میں بیٹھتے اور خصوصاً اس زمانہ میں جب بابا تاجؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ قبلہ درانی صاحب کو جبل پور والے بابا سے یوں بھی لگاؤ تھا کہ وہ بابا تاجؒ کے وصال کے بعد مجسم غم کی تصویر بن گئے تھے۔ جسے کہیں "میں بھول گئیاں تیرے سنگ نہ گئیاں" یا جیسے "چھپ گیا سورج رہ گئی لالی" بابا تاجؒ سے اسی لگاؤ کی بنا پر جو خود قبلہ کو بابا تاج سے تھا۔ یہاں تک کہ روئیں روئیں میں تاج الدینؒ بسا تھا اور جسم کی یہ حالت تھی کہ ایک سوکھی پتی کی طرح رہ گیا تھا۔ اسی لئے جبل پور والے بابا کے پیچھے پڑ گئے کہ اپنا جیسا عاشق بنا دو انہوں نے فرمایا تم اس آگ میں کیوں جلتے ہو۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تاج الدین مل گئے۔ یہ سبق قبلہ نے ایسا یاد کیا کہ اگلے تیرہ سال اسی کے سہارے ظاہر باطن کے چراغ روشن رہے۔ بابا اندر ہی بسا تھا پھر جب ۱۹۴۸ء میں بابا قادر اولیاء کے حضور پیش ہوئے تو اسی نورِ تاج دینی کی جھلک دیکھ کر بابا قادر اولیاء نے اپنی ساری شفقتیں ان ہی پر نچھاور کر دیں۔ بابا تاج کا جلال اور جذب آگے کے ارتقائے روحانی کے لئے بھی شدتِ بنیاد بنا رہا اور زندگی کے خصوصی موقعوں پر اسی برق تجلی نے تاریکیوں کے سینے چیر کر امر ربانی اور نور حق کے اجراء کی ضمانت لی۔ وہ اِک نظر کہ جدھر اٹھ گئی۔ برق بن کر گری اور خانۂ دل میں محبتوں کو اُجاگر کر گئی۔ یا وہ شدتِ کیف میں منہ سے نکلی بات کو جو کہا ویسا ہی ہوا۔